ایلافؔ

(شعری مجموعہ)

رؤف خیر

Raoof Khair, M.A. Lecturer
9-10-202/19, Baith-ul-Khair,
Risala Bazar, Golconda,
HYDERABAD-500 008.

بار اوّل ــــ تعداد : ایک ہزار
سالِ اشاعت : جنوری ۱۹۸۲ء
قیمت : دس روپے

کتابت : ــــ ادارہ "گلِ نو" چھتہ بازار حیدرآباد۔۲
ناشر : ــــ "گلِ نو پبلیکیشنز" چھتہ بازار حیدرآباد۔۲

ٹائیٹل کی کتابت : ــــ محمود سلیم
مطبع : ــــ اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد۔۲

بہ اشتراک اردو اکیڈمی آندھرا پردیش حیدرآباد

ملنے کے پتے :
الیاس ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
اردو اکیڈمی، بک ڈپو، اے سی گارڈز حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴
سیما پبلشرز اینڈ بکس پروموٹرس، دینک گیری نگر حیدرآباد ۴۵۔
رؤف خیر ۱۲۷-۴-۱۳ سبزی منڈی حیدرآباد ۵۰۰۲۶۷

انتساب

حالات کے نشیب و فراز کے نام

تعارف

نام	رؤف خیر
تعلیم	بی اے (عثمانیہ)
پیشہ	سٹینوگرافر
تاریخ پیدائش	۵ نومبر ۱۹۴۸ء
وطن	حیدرآباد دکن
پتہ	معرفت ادارہ "گل بو"
	پرانی حویلی، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

پیش لفظ

جمیل شیدائی

رؤف خیر کی شاعری کی سب سے نمایاں خوبی اُن کے "ترائیلے" ہیں
ترائیلے دراصل فرانسیسی صنفِ شاعری ہے جس میں آٹھ مصرعے
دو قافیوں سے لکھے جاتے ہیں اور پہلا مصرع چوتھے اور ساتویں
مصرع کی جگہ اور دوسرا مصرع آٹھویں یا آخری مصرعے کی جگہ دہرایا
جاتا ہے۔

اس صنفِ شاعری کی خوبی اور کامیابی اِس بات میں مضمر ہے
کہ مصرعوں کا اعادہ فطری جیسا ہو اور ناگزیر لگے اور اِس طرح اعادہ
سے مختلف معنی نکلتے ہوں یا نفسِ مضمون کی تشریح ہوتی ہو۔ ترائیلے
کے تاریخی پس منظر کے بارے میں O. Bloch اور
W. Von Wartburg نے فرانسیسی زبان کی

ڈکشنری میں لکھا ہے کہ ترائیلے ۱۴۸۶ء تک نامعلوم سا لفظ تھا۔ حالانکہ یہ صنف بہت زیادہ قدیم ہے کیونکہ قرونِ وسطیٰ کے شاعر جیسے: Froissart اور Deschamps نے بھی ترائیلے لکھے ہیں۔ مگر پندرہویں صدی کے اواخر سے یہ صنف نظر انداز کر دی گئی اور پھر اسے سترہویں صدی میں: Vincent Voiture اور Jean-de-La Fontaine نے دوبارہ رائج کیا۔ انگلستان میں صرف Patric Carey نے ۱۶۵۱ء میں چند مذہبی ترائیلے لکھے تھے۔ اس وقت سے اب تک اس صنف میں کوئی خاص کام نہیں ہوا مگر اب انگلستان میں ترائیلے لکھنے والے کئی شاعر ہیں جیسے: H.C. Beumer، Austin Dobson اور W. E. Henley وغیرہ۔

یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ ہماری شاعری ترقی یافتہ زبانوں سے ہمیشہ متاثر رہی ہے خصوصاً اس فرانسیسی نظم کے فارم پر رؤف خیر کو جس طرح دسترس ہے، اس سے اِس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو میں بہت زیادہ وسعت ہے اور وہ کسی زبان کے کسی بھی فارم کی متحمل ہو سکتی ہے۔ رؤف خیر کے ترائیلے اپنے نفسِ مضمون کے اعتبار سے متنوع اور دلچسپ ہیں مثلاً ان کا ایک

ترائیلے ہے جس کا عنوان ہے "اعتراف"

میں جہاں ہوں وہاں اوس و خزرج بھی ہیں
ایک آوازِ حق بھی، سمیہ بھی ہے
گھر کے آنگن ابوجہل کے کج بھی ہیں
میں جہاں ہوں وہاں اوس و خزرج بھی ہیں
چور، زانی، شرابی ہیں اور نج بھی ہیں
میں ہوں سب سے الگ سب سے رشتہ بھی ہے
میں جہاں ہوں وہاں اوس و خزرج بھی ہیں
ایک آوازِ حق بھی، سمیہ بھی ہے

اِس مختصر سی نظم (ترائیلے) میں ہمارے معاشرے کی کامیاب تصویرکشی کی گئی ہے۔ خیر و شر کی قوتیں اور ان کے توازن سے سماجی اقدار تشکیل پاتے ہیں۔ چونکہ شاعر سماج ہی کا ایک فرد ہوتا ہے اس لئے اس کا رشتہ سماج سے اٹوٹ ہے۔ اس کی انفرادیت اسے سب سے الگ تو کرتی ہے مگر الگ ہونے کے احساس کے ساتھ ع

"میں ہوں سب سے الگ سب سے رشتہ بھی ہے"

یہی خاص بات رؤف خیر کے کلام میں ہوتی ہے کہ وہ ذات

کو معاشرے سے الگ کر کے نہیں دیکھتے بلکہ اس کا ایک حصہ ایک جز ہو کر اس پر نظر ڈالتے ہیں اور یاسیت کے احساس کے ساتھ صورت حال اور ماحول پر چست فقرے کستے ہوئے گزر جاتے ہیں انکی مجبوری جیسے ترائیلے "کوہِ ندا" سے ظاہر ہوتی ہے ایک سماج کی مجبوری ہے۔ اس مجموعے میں بہت اچھی اچھی نظمیں ملتی ہیں جیسے "دیوار"، "انجام کار"، "بیلف"، "بندگلی"، "گواہِ سرگشتہ" وغیرہ۔

Cleanth Brooks اپنی کتاب Understanding Poetry میں لکھا ہے کہ شاعری ہمیں علم دیتی ہے۔ یہ علم خود ہمارے بارے میں ہی ہوتا ہے جو تجرباتی دنیا سے اخذ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ رؤف خیر کی تجرباتی دنیا کی وسعت مسلم ہے اور بالغ شعور کی وجہ سے ان کے تجربے رائگاں نہیں جاتے بلکہ ہمارے ذہنوں پر ایک خاص کیفیت مرتسم کر جاتے ہیں۔ Wordsworth نے شاعری کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو دوسرے انسانوں سے بات کرتا ہے اس لحاظ سے رؤف خیر کی باتیں لایعنی گنجلک نہیں اور نہ Soliloquy کی طرح یہ باتیں خود سے ہوتی ہیں بلکہ ان کی باتوں میں متانت ہے، بھرپور اعتماد ہے لہجے کا

ریلاف

بانکپن ہے اور سچا تجربہ ہے جو سننے والوں کو چونکاتا بھی
ہے اور دعوت فکر بھی دیتا ہے۔

اِقرا اور رؤف خیر کے بارے میں

ڈاکٹر ظ۔ انصاری (بلٹز بمبئی، ۳۰ ستمبر ۱۹۷۷ء)

حیدرآباد کے رؤف خیر کا شعری مجموعہ کھولا تو ایسا معلوم ہوا کہ گیلی لکڑیوں کی ٹال پر جوا یندھن تلوایا۔ اس میں صندل کی ٹہنی بھی چلی آئی ہے — مہکتی ہوئی..... رؤف خیر نے جہاں تک نظر گئی حسن اور درد سے آنچ لی ہے پڑوسی کے چولھے سے نہیں مانگی۔ کچی مشق کے باوجود وہ سچے شاعر ہیں۔

ڈاکٹر عالم خوندمیری (۷ اگست ۱۹۷۷ء)

رؤف خیر کو یقیناً صالح جدیدیت کا علمبردار کہا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں عقلیت *Rationality* کا عنصر بہت زیادہ

نمایاں ہے اور بہت کم ادیب ہوتے ہیں جو ادب میں عقلیت کو
اہمیت دیتے ہیں اور اسے برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔
رؤف خیر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اسے سلیقے
سے برتا اور اپنی انفرادیت دکھائی۔ رؤف خیر کی شاعری میں احتجاج
اور بغاوت صرف اک کرب کی صورت میں نہیں بلکہ تہذیب نو کے
ساتھ ہیں جو بہت کم شاعروں اور ادیبوں کے حصے میں آتا ہے۔ انہوں
نے مذہب اسلام کی بعض تلمیحات کو اپنے دور پر منطبق کر کے اپنی
عصری حسیت کو ایک چونکا دینے والا لہجہ دیا۔ یہی ان کی شاعری کا
ایک وصف خاص ہے۔

ڈاکٹر مغنی تبسم (۷ راگست ۷۷ء)
اگر "اقرا" شائع نہ ہوتا تو ہماری دانشورانہ زندگی میں اک
کمی سی محسوس کی جاتی۔

مصلح الدین سعدی (۷ راگست ۷۷ء)
رؤف خیر نے نئی نئی تراکیب کے ذریعے اردو ادب کو مالامال
کیا ہے۔ ان کے' زبان کے تجربے اپنی جدولی معنویت کے اعتبار

سے ادبی ماحول میں یقیناً الگ الگ مقام رکھتے ہیں ۔

عزیز قیسی
(۷؍ اگست ۱۹۷۷ء)

آپ کا مجموعہ کلام "اقرا" ملا ۔ اور ایک ہی نشست میں اس کی قرأت بھی میں نے کر لی ۔ ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اس لائق سمجھا ورنہ اہلِ حیدرآباد تو مجھے اپنا سمجھ کر "اپنوں" جیسا ہی سلوک کرتے ہیں ۔

آپ کی شاعری متاثر کرتی ہے ۔ اور یہی ایک وصف بہت غنیمت ہے اس زمانے میں ۔ تفصیلی رائے تو آپ نے مانگی تھی میں اپنے آپ میں اتنا وقوف محسوس کرتا ہوں کہ دوں ۔ پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمارے بعد اس شہر میں آپ ہی اچھے آپ کی شاعری میں بڑی توجہ سے پڑھ رہا ہوں آپ دن بدن مشاہدات کر رہے ہیں خوشی ہوتی ہے ۔

اظہار
سلمیٰ جاوید (۲۵ ستمبر ۱۹۷۷ء) مدیرہ زیور پٹنہ

ہے خیر کے کلام میں کس درجہ سوز و ساز | جذبِ دروں کو خالقِ اقرا سے پوچھئے

پڑھ کر خلوصِ قلب سے ہوتا ہے دل گداز | ہے خیر کے کلام میں کس درجہ سوز و ساز

کتنا حقیقتوں سے قریب آگیا مجاز | لطفِ سخن جو ہے دلِ سلمیٰ سے پوچھئے

ہے خیر کے کلام میں کس درجہ سوز و ساز | جذبِ دروں کو خالقِ اقرا سے پوچھئے

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید (۱۰ر دسمبر ۱۹۷۷ء)

میں نے ہمیشہ ہی آپ کا کلام دلچسپی اور توجہ سے پڑھا ہے۔ اور محظوظ ہوا ہوں۔ اِدھر جو شاعر نئی غزل میں اپنی آواز بنا رہے ہیں / بنا چکے ہیں آپ ان میں سے ایک ہیں۔ آپ کے ہاں غزل کے نئے پن کے ساتھ روایات کا پاس اور احترام بھی ہے۔ الفاظ کی تراش خراش میں ندرت، نکھرے نکھرے مصرعے، تشبیہات و استعارات میں دلنوازی، گہری معنویت، فکر انگیزی اور بحیثیت مجموعی غزل نگاری کا یہ تیکھا تیکھا انداز، یہ ڈکشن، روایت کے صحیح اور صحتمند احساس و ادراک کے بغیر ممکن نہیں۔ اردو شاعری کے لئے یہ فالِ نیک ہے۔

آپ کی منظومات (بشمولِ ترائیلے) بھی ایک بانکپن لئے ہوئے ہیں۔ بیشتر نظموں میں عصری زندگی اور اس کے مسائل کی جھلک خاصی عمدگی سے ملتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلماتِ خیر

فرانسیسی صنفِ سخن "ترائیلے" اردو میں بہت کم شاعروں نے
اپنائے۔ حتیٰ کہ نریش کمار شاد جیسے ہر فن مولا قسم کے آدمی نے بھی
صرف تفننِ طبع کے طور پر ہی "ترائیلے" کہے۔ شاید اس کا سبب ترائیلے
کے مصرعوں کا وہ دہراؤ ہے جو فنی رچاؤ کی کمی کے باعث پڑھنے
اور سننے والے کو بار گزر سکتا ہے۔ یہ آٹھ مصرعوں کی چھوٹی سی
نظم بڑی خاص توجہ چاہتی ہے مصرعوں کی ترتیب و آہنگ کا خیال
رکھنا آج کل اذیت کوشی کے مترادف سمجھا جانے لگا ہے۔ کیونکہ
پابند نظم سے آزاد و معرا نظم، غزل سے آزاد غزل اور پھر نثری نظم
تک جو سفر ادب نے طے کیا ہے وہ پابندیوں سے آزادیوں کی طرف
سفر کی علامت ہے ایسے میں آٹھ مصرعوں کا التزام اور پھر دو مصرعوں
کا خاص ترتیب کے ساتھ دہراؤ ممکن ہے اچھا نہ لگے۔ مگر اس کا

کیا کیا جاتا ہے کہ ترائیلے میں مزاج لگ گیا۔ چنانچہ میں نے بے شمار ترائیلے لکھے۔ کچھ "اقرا" میں چھپے اور اب جملہ ترائیلوں کا ایک انتخاب "ایلاف" کے نام سے پیش ہے۔

"ترائیلے" کی تاریخ دہرانے کی یہاں میں چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ فرانس میں کس کس نے لکھے، انگریزی میں کس نے لکھے اٹلی میں کن شاعروں نے اپنایا، فارسی میں کن شاعروں نے اسے روشناس کروایا اور پھر اردو میں کس طرح یہ صنف در آئی۔ اتنا ضرور ہے۔ ابتدا میں اچھے ترائیلے نریش کمار شاد نے لکھے پھر یہ صنف میں نے سنجیدگی سے اپنائی جس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ اس میں شک نہیں فرحت کیفی مرحوم نے بھی ترائیلے کہے اور اپنا ایک مجموعہ "پتہ پتہ بوٹا بوٹا" بھی دیا۔ اس لحاظ سے میرا مجموعہ "ایلاف" ترائیلوں پہ مشتمل دوسرا مجموعہ ہے۔

اُمید کہ مری یہ کاوشیں نگاہِ اعتبار میں کسی قابل ضرور ٹھہرینگی۔
اِس مجموعے کی اشاعت کے لئے ادارہ "گل بوٹے" نے جس پُرخلوص تگ و دو کا مظاہرہ کیا اس کے بغیر اس کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

رؤف خیر

۵ نومبر ۱۹۷۹ء

ترائیلے

آتش برگ

۳ر جون ۱۹۷۸ء

۱

مجھے کچھ لوگ ہی پہچانتے ہیں
بظاہر برف کا تودہ ہوں لیکن
مری قیمت بہت کم جانتے ہیں
مجھے کچھ لوگ ہی پہچانتے ہیں
جو امرت بھی مجھے گردانتے ہیں
مری خاطر لگے گی آگ اک دن
مجھے کچھ لوگ ہی پہچانتے ہیں
بظاہر برف کا تودہ ہوں لیکن ....

۲

میں بے مصرف بظاہر بے سبب ہوں
مگر میرا زمانے پر تصرف
میں خاک باد و آتش آب سب ہوں
میں بے مصرف بظاہر بے سبب ہوں
تمہاری راہ کی دیوار کب ہوں
تمہیں خوش آئیگا میرا تعارف
میں بے مصرف بظاہر بے سبب ہوں
مگر میرا زمانے پر تصرف

۳

زلیخاؤں میں ہوں دامن سلامت
سراسر یوسفِ دامانِ تر ہوں
ہے دامن پھاڑنے کی کیا ضرورت
زلیخاؤں میں ہوں دامن سلامت
کسی کو بھی نہیں مجھ سے شکایت
میں سب کے حق میں اک پیمانِ تر ہوں
زلیخاؤں میں ہوں دامن سلامت
سراسر یوسفِ دامانِ تر ہوں

۴

جو ممکن ہو تو ہو تقسیم لیکن
مری تشکیل تو ممکن نہیں ہے
بکھر جانا مقدّر ہے ہی اک دن
جو ممکن ہو تو ہو تقسیم لیکن
میں ہوں احساں فراموشوں کا محسن
مری تمثیل تو ممکن نہیں ہے
جو ممکن ہو تو ہو تقسیم لیکن
مری تشکیل تو ممکن نہیں ہے

۵

مرے باہر بلا کی آندھیاں ہیں
مرے اندر سکونِ خواب جیسا
ثمر آور وہ جو ہر آبیاں ہیں
مرے باہر بلا کی آندھیاں ہیں
مرے شہداب سے سیرابیاں ہیں
خرابہ، بستی شاداب جیسا
مرے باہر بلا کی آندھیاں ہیں
مرے اندر سکونِ خواب جیسا

٦

کرم کرنے پہ ہوں میں کب سے مائل
بقول اقبال کوئی تو ہو سائل
مری ہستی نہ ہو قاروں شمائل
کرم کرنے پہ ہوں میں کب سے مائل
زمین و آسماں ہیں میرے قائل
الگ ہیں تم سے کب میرے مسائل
کرم کرنے پہ ہوں میں کب سے مائل
بقول اقبال کوئی تو ہو سائل

دیوار
(اپنے اکلوتے بھائی کے نام)

ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا
ایک ہی شہر میں رہتے ہیں نہ رہنے کی طرح
اتنا بودا تو نہ تھا خون کا رشتہ اپنا
ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا
اپنی اپنی ہے خوشی، درد ہے اپنا اپنا
ہم ہوئے شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح
ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا
ایک ہی شہر میں رہتے ہیں نہ رہنے کی طرح

۲۱ر اگست ۱۹۷۸ء

ٹائم کیپسول

بنو اُمیّہ ہی باقی نہ رہے بنو عباس
نہ اپنے آپ کو دہرا کے تھک سکی تاریخ
ہوا و حرص بھلا کس کو آسکے ہیں راس
بنو اُمیّہ ہی باقی نہ رہے بنو عباس
سروں میں دفن ہوئی اقتدار کی بُو باس
ہر ایک حرفِ ہوس پر کھنچا خطِ تنسیخ
بنو اُمیّہ ہی باقی نہ رہے بنو عباس
نہ اپنے آپ کو دہرا کے تھک سکی تاریخ

اعراف

میں جہاں ہوں وہاں اوس و خزرج بھی ہیں
ایک آوازِ حق بھی، سمیّہ بھی ہے
گھر کے آنگن ابوجہل کے گنج بھی ہیں
میں جہاں ہوں وہاں اوس و خزرج بھی ہیں
چور، زانی، شرابی ہیں اور نج بھی ہیں
میں ہوں سب سے الگ سب سے رشتہ بھی ہے
میں جہاں ہوں وہاں اوس و خزرج بھی ہیں
ایک آوازِ حق بھی، سمیّہ بھی ہے

رشوت

آتا ہے رہ رہ کے چہرے کا خیال
مچھلیاں، ہفتہ، سمندر بے کنار
خشک لب، آنکھوں میں اک جلتا سوال
آتا ہے رہ رہ کے چہرے کا خیال
دستِ خالی میں لکھا ہے گھر کا حال
دم بخود ہوں درمیانِ نور و نار
آتا ہے رہ رہ کے چہرے کا خیال
مچھلیاں، ہفتہ، سمندر بے کنار

ٹرمپ کارڈ

کوئی حربہ ہو، اب پرکھ دیکھو
آخری تیر میرے ترکش کا
سر ہتھیلی پہ اپنا رکھ دیکھو
کوئی حربہ ہو، اب پرکھ دیکھو
زہر کا ذائقہ نہ چکھ دیکھو
توڑ دے گا غرور سرکش کا
کوئی حربہ ہو، اب پرکھ دیکھو
آخری تیر میرے ترکش کا

عرفان کے بعد

چاند سے راہ کیجیئے معلوم
اور سورج سے حال موسم کا
اسکی آنکھیں نہیں رہیں معصوم
چاند سے راہ کیجیئے معلوم
اسکے لہجے میں ڈھونڈیئے مفہوم
رنگ کچھ اور ہی ہے ظالم کا
چاند سے راہ کیجیئے معلوم
اور سورج سے حال موسم کا

۳۱ جنوری ۹۷ء

شہ مات

پندار ٹوٹنا ہے الٹنا بساط کا
یوں بھی ہوا کہ پیادوں سے شہ مات ہو گئی
اک مہرہ غلط ہے سبب اختلاط کا
پندار ٹوٹنا ہے الٹنا بساط کا
کتنا کٹھن رہا ہے سفر احتیاط کا
دو شاطروں سے کتنی بڑی بات ہو گئی
پندار ٹوٹنا ہے الٹنا بساط کا
یوں بھی ہوا کہ پیادوں سے شہ مات ہو گئی

۲۲ جولائی ۱۹۷۸ء

"بن باس"

مجھے گدی تو اک دن چھوڑنی ہے
یہ کیوں بن باس پر بھیجا گیا ہوں
مری ہمدرد کیسی کیکئی ہے
مجھے گدی تو اک دن چھوڑنی ہے
پتا راجہ تو بس مجبور بھی ہے
میں اب جنگل کا راجہ ہو چکا ہوں
مجھے گدی تو اک دن چھوڑنی ہے
یہ کیوں بن باس پر بھیجا گیا ہوں

"کارِ جہاں دراز ہے"

آدمی برسرِ بغاوت ہے
قعرِ ذل سے قصرِ احسن تک
فاصلہ یوں تو بے نہایت ہے
آدمی برسرِ بغاوت ہے
سر سے پا تک جوازِ محنت ہے
منّ و سلویٰ سے پیازِ لہسن تک
آدمی برسرِ بغاوت ہے
قعرِ ذل سے قصرِ احسن تک

رنگ ماسٹر

نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن
کہ ہم تو سرکس کے جانور ہیں
اشارۂ تازیانہ ہے فن
نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن
یہ سب ریاکاریوں کا مامن
یہ ہم اداکار بے نگر ہیں
نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن
کہ ہم تو سرکس کے جانور ہیں

۶؍فروری سنہ ۱۹۷۹ء

جیتے جی

دیکھا نہ جائے ہے تری بے چہرگی کا دکھ
اے مرگِ ناشناخت مرا نام پیش ہے
(یہ کس غریب سے نہ اٹھا زندگی کا دکھ)
دیکھا نہ جائے ہے تری بے چہرگی کا دکھ
دیکھوں تو جیتے جی بھی کبھی خودکشی کا دکھ
یہ زندگی تو اپنے لئے اک گزینش ہے
دیکھا نہ جائے ہے تری بے چہرگی کا دکھ
اے مرگِ ناشناخت مرا نام پیش ہے

سیلاب کی بھینٹ

اے عروجِ بے جسمی اے زوال رُو پوشی
مالتھوزین[1] تھیوری تھی کہ مرگِ سرگوشی
وہ زبانِ سیلابی اور آدمی نوشی
اے عروجِ بے جسمی اے زوال رُو پوشی
بچ گئے تو ٹھیرایا سب نے نوح کو دوشی
ایک دن کی تنخواہیں دو[2] منٹ کی خاموشی
اے عروجِ بے جسمی اے زوال رُو پوشی
مالتھوزین تھیوری تھی کہ مرگِ سرگوشی

ایک ماہر معاشیات کے نظریۂ آبادی کی طرف اشارہ ہے۔ جمیرہ

زمیں کا ربط

زمیں کا ربط زمان و مکاں میں حائل ہے
وگرنہ لطفِ سفر بے گھری میں کیا کیا تھا
یہ اک تعلقِ خاطر کہ جاں میں حائل ہے
زمیں کا ربط زمان و مکاں میں حائل ہے
یہ نفس بھی ہے عجب، دو جہاں میں حائل ہے
سکونِ دل کو اسی بے سری میں کیا کیا تھا
زمیں کا ربط زبان ِمکان میں حائل ہے
وگرنہ لطفِ سغر بے گھری میں کیا کیا تھا

چارہ

وہ پھر ایک شیرے کا قطرہ ہے دیوار پہ
وہ پھر اسکی جانب کھسکتی ہوئی چھپکلی
جھپٹتی وہ بلی شکار نمودار ـــــ پہ
وہ پھر ایک شیرے کا قطرہ ہے دیوار پہ
وہ بلی پہ غراتا کُتا گرا چار پہ
لگا شہر میں کرفیو ایک بھگدڑ مچی
وہ پھر ایک شیرے کا قطرہ ہے دیوار پہ
وہ پھر اسکی جانب کھسکتی ہوئی چھپکلی

۲۹ مئی سنہ ۱۹۷۹ء

بازی گر

بادشاہوں، بیگموں اور جوکروں میں رہ گئے
تم نے کاٹا کرفیو کا وقت رمی کھیلتے
ہائے کتنے باحیا تھے، مسخروں میں رہ گئے
بادشاہوں، بیگموں اور جوکروں میں رہ گئے
کتنے صندل سے بدن جلتے گھروں میں رہ گئے
کھیلنا ہی تھا تمہیں تو جاں کی بازی کھیلتے
بادشاہوں، بیگموں اور جوکروں میں رہ گئے
تم نے کاٹا کرفیو کا وقت رمی کھیلتے

یکم اگست ۱۹۷۸ء

گھر

ترے وجود میں لوٹ آئے ہم تو بھول گئے
وہ ایک اِسم کہ کھُلتے ہیں جس سے دروازے
ملی جو چشمِ فسوں ساز، رم تو بھول گئے
ترے وجود میں لوٹ آئے ہم تو بھول گئے
سفالی جسم ملا، جام جم تو بھول گئے
غلط نہیں نگہِ کم سخن کے اندازے
ترے وجود میں لوٹ آئے ہم تو بھول گئے
وہ ایک اِسم کہ کھُلتے ہیں جس سے دروازے

۱۰ ر اگست سنہ ۱۹۷۹ء

عَلَّمَ بِالْقَلَمْ

وہ اے بی سی ڈی ہو کہ ہو گنتی کا سلسلہ
ہر بے سفید چیز پہ لکھتی ہے چاک سے
ایلاف خیری جانے لگی جب سے مدرسہ
وہ اے بی سی ڈی ہو کہ ہو گنتی کا سلسلہ
ہر لفظ چیخ چیخ کے کرنے لگی ادا
پڑھتی ہے ہاتھ باندھ کے اور کس تپاک سے
وہ اے بی سی ڈی ہو کہ ہو گنتی کا سلسلہ
ہر بے سفید چیز پہ لکھتی ہے چاک سے

اہم کردار

سب سمجھتا ہوں کوئی بچہ نہیں
میں ڈرامے کا اہم کردار ہوں
میرے آگے پیچھے اب کیا کیا نہیں
سب سمجھتا ہوں کوئی بچہ نہیں
کار کا میں پانچواں پہیہ نہیں
جیت ہوں اپنی جگہ یا ہار ہوں
سب سمجھتا ہوں کوئی بچہ نہیں
میں ڈرامے کا اہم کردار ہوں

نومبر ۱۹۷۹ء

خاموش تماشائی

نہ میں عرب ہوں نہ دنیا عجم ہے میرے لیئے
حقیقتاً ہوں میں سرتاپا گوش بر آواز
خوشی یہی ہے کہ اتنا سا غم ہے میرے لیئے
نہ میں عرب ہوں نہ دنیا عجم ہے میرے لیئے
میری خموشی ہی گویا بھرم ہے میرے لیئے
نہ لاسکے گا کوئی میری بات کا انداز
نہ میں عرب ہوں نہ دنیا عجم ہے میرے لیئے
حقیقتاً ہوں میں سرتاپا گوش بر آواز

نومبر ۱۹۷۹ء

میٹھی گولیاں

ہم تو سمجھ رہے تھے کہ میٹھی ہیں گولیاں
اتنی خبر نہ تھی ہمیں، کوکین ان میں ہے
لگتی تھیں دیکھنے میں تو پیاری نمبولیاں
ہم تو سمجھ رہے تھے کہ میٹھی ہیں گولیاں
کن بولیوں میں کھیلی ہیں یاروں نے ہولیاں
چبھتا ہوا سا جذبۂ سنگین ان میں ہے
ہم تو سمجھ رہے تھے کہ میٹھی ہیں گولیاں
اتنی خبر نہ تھی ہمیں، کوکین ان میں ہے

No Man's Land

یہ تمہاری کوکھ سے جنما نہیں ہے
اس سے اپنا کیا کوئی رشتہ نہیں ہے
یہ ہمارے ہاتھ کا لکھا نہیں ہے
یہ تمہاری کوکھ سے جنما نہیں ہے
اس کا ہونا پھر بھی کیا ہونا نہیں ہے
اس کی ماں بے شک کوئی سیتا نہیں ہے
یہ تمہاری کوکھ سے جنما نہیں ہے
اس سے اپنا کیا کوئی رشتہ نہیں ہے

Hang Over

سنپولا دودھ پیتے پیتے اک دن
لہو انسان کا پینے لگا تھا
لہو کا نشّہ زہریلا تھا لیکن
سنپولا دودھ پیتے پیتے اک دن
جو پہنچا — تا سوادِ حدِّ ممکن
سوا نیزے پہ سورج آ گیا تھا
سنپولا دودھ پیتے پیتے اک دن
لہو انسان کا پینے لگا تھا

کوہِ ندا

آج لو پھر وہ دس بج گئے
ہم چلے دفتروں کی طرف
بدحواسی میں ہم سج گئے
آج لو پھر وہ دس بج گئے
خواب دہلیز پر تج گئے
پھر نہ دیکھا گھروں کی طرف
آج لو پھر وہ دس بج گئے
ہم چلے دفتروں کی طرف

ارتکاز

لہو کا بہنا تو ہے ارتکازِ جاں کی نفی
لہو جمے تو کہیں کوئی شکل ابھرے گی
ثباتِ حرفِ یقیں ہو تو ہو گماں کی نفی
لہو کا بہنا تو ہے ارتکازِ جاں کی نفی
خبر یہ آئے کہیں سے ہوئی زیاں کی نفی
سواری خیمۂ گل میں کسی کی ٹھہرے گی
لہو کا بہنا تو ہے ارتکازِ جاں کی نفی
لہو جمے تو کہیں کوئی شکل ابھرے گی

نومبر ۱۹۷۹ء

چلکا

مرے اندر اندھیرا ہی اندھیرا
تمہاری ذات چلکا نور کا ہے
جدھر دیکھو ہے سناٹا گھنیرا
مرے اندر اندھیرا ہی اندھیرا
زمانے بھر کی الجھن کا ہے ڈیرا
مگر ڈیرے میں اک سوراخ سا ہے
مرے اندر اندھیرا ہی اندھیرا
تمہاری ذات چلکا نور کا ہے

بندگی

میں عمرِ عشق کی اس رہگذر میں ایک ہی ہوں
یہ جانتے ہوئے آگے ہے راستہ مسدود
میں ہار جیت کا قائل ہوں صلح کیسے کروں
میں عمرِ عشق کی اس رہگذر میں ایک ہی ہوں
جہاں سے لوٹنا چاہوں تو لوٹ بھی نہ سکوں
نفس کی ڈور ہے سلگی ہوئی بدن بارود
میں عمرِ عشق کی اس رہگذر میں ایک ہی ہوں
یہ جانتے ہوئے آگے ہے راستہ مسدود

نومبر ۱۹۷۹

انقلاب

عکسِ ہوس ہے آنکھ پر خاک ہے آفتاب پر
دیکھوں تو آسماں پہ کتنی سیاہی اور ہے

وقت وہ سازگار تھا یہ تو فضا ہی اور ہے
دیکھوں تو آسماں پہ کتنی سیاہی اور ہے

وہ جو شریکِ جرم تھا اسکی گواہی اور ہے
اندھی ہے یوں بھی منصفی حیراں ہوں انقلاب پر

عکسِ ہوس ہے آنکھ پر خاک ہے آفتاب پر
دیکھوں تو آسماں پہ کتنی سیاہی اور ہے

یہ صوتی ہم آہنگی کی خاطر ترتیب کی تبدیلی کا تجربہ کیا گیا ہے — ح — ر

بیلف

بے گناہوں کو سزا دینی پڑی ہے
ہم بھی کن ہاتھوں کے پتھر ہو گئے ہیں
کیا اذیت ہے جو سہہ لینی پڑی ہے
بے گناہوں کو سزا دینی پڑی ہے
ناؤ منجدھاروں میں بھی کھینی پڑی ہے
ہم ہوا، لنگر، سمندر ہو گئے ہیں
بے گناہوں کو سزا دینی پڑی ہے
ہم بھی کن ہاتھوں کے پتھر ہو گئے ہیں

گواہِ برگشتہ

اُسی سے آس تھی جو ہے گواہِ برگشتہ
میں بے گناہ تو انصاف کا شکار بھی تھا
نہ جانے کس لئے سچّائی سے گریزاں تھا
اُسی سے آس تھی جو ہے گواہِ برگشتہ
اُسے معاف کیا میں نے خونبہا اپنا
ہزار کچھ سہی وہ شخص اپنا یار بھی تھا
اُسی سے آس تھی جو ہے گواہِ برگشتہ
میں بے گناہ تو انصاف کا شکار بھی تھا

۱۲ر جنوری ۹۷ء

سرگرانی اور ہے ......

شوق پڑھنے کا بہت تھا تو کتابیں کمیاب
وقت ارزاں ہو تو پھر جاں پہ گراں ہوتا ہے
چہرہ چہرہ میں پیا کرتا ہوں تازہ زہراب
شوق پڑھنے کا بہت تھا تو کتابیں کمیاب
اب مرے پاس کتابیں تو ہیں بے حد و حساب
جنکے پڑھنے کو مگر وقت کہاں ہوتا ہے
شوق پڑھنے کا بہت تھا تو کتابیں کمیاب
وقت ارزاں ہو تو پھر جاں پہ گراں ہوتا ہے

دوراہا

ہم پھر قریب آکے بہت دور ہو گئے
تم میں جو ہے وہ اپنی انا کا شکار ہے
میں نار ہو گیا ہوں کہ تم نور ہو گئے
ہم پھر قریب آکے بہت دور ہو گئے
مجھ میں ہزار طرح کے ناسور ہو گئے
مجھ سے پرے رہو یہ تمہیں اختیار ہے
ہم پھر قریب آکے بہت دور ہو گئے
تم میں جو ہے وہ اپنی انا کا شکار ہے

درد

ترا خیال ہے اک پیرِ تسمہ پا مجھکو
تجھے خبر بھی ہے کیا کیا میں اپنی ذات سے تھا
وہ دشتِ گمشدگی نے نگل لیا مجھکو
ترا خیال ہے اک پیرِ تسمہ پا مجھکو
کہوں میں کس سے خدارا ذرا بچا مجھکو
لہولہان میں یہ کیسے تجربات سے تھا
ترا خیال ہے اک پیرِ تسمہ پا مجھکو
تجھے خبر بھی ہے کیا کیا میں اپنی ذات سے تھا

۱۹۶۷ء

احساس

تمہارے قرب سے ابھری ہیں، دوریاں کیا کیا
میں کھو گیا ہوں کہ یہ حادثہ بھی ہونا تھا

تمہیں خبر ہے ہوا ذہن کا زیاں کیا کیا
تمہارے قرب سے ابھری ہیں، دوریاں کیا کیا

چبھی ہیں پائے تجسس میں کرچیاں کیا کیا
شکست ذات کا یہ تجربہ بھی ہونا تھا

تمہارے قرب سے ابھری ہیں، دوریاں کیا کیا
میں کھو گیا ہوں کہ یہ حادثہ بھی ہونا تھا

۱۹۷۴ء

مصالحت

ترا خلوص، مری روح سے گزر نہ سکا
مرا خلوص بھی اب جسم کا تقاضہ ہے
ترے سلوک سے احساسِ درد مر نہ سکا
ترا خلوص، مری روح سے گزر نہ سکا
میں اپنی پیاس کا تجھ سے گلہ بھی کر نہ سکا
مصالحت کا بھی شاید یہی طریقہ ہے
ترا خلوص مری روح سے گزر نہ سکا
مرا خلوص بھی اب جسم کا تقاضہ ہے

تتلی

کچے رنگوں سے بنائی ہوئی تصویر ہے تو
مجھکو یہ ضد کہ ترے لمس کی لذت بھی ملے
ایک دیوار پہ لکھی ہوئی تحریر ہے تو
کچے رنگوں سے بنائی ہوئی تصویر ہے تو
کوئی تتلی ہے کہ بیگانۂ تعمیر ہے تو
رنگ ہی رنگ کروں کیا تری صورت بھی ملے
کچے رنگوں سے بنائی ہوئی تصویر ہے تو
مجھکو یہ ضد کہ ترے لمس کی لذت بھی ملے

ہائی جاک

یہ کس بدن میں اتارا گیا مجھے لا کے
یہ کون مجھ میں چھپا تھا حریفِ نامحسوس
سُنیے تجھے کیا کیا نہ ملیں نئے حیات کے خاکے
یہ کس بدن میں اتارا گیا مجھے لا کے
یہ کون ہے جو مجھے یرغمال ٹھیرا کے
ہوا ہے میری طرح اپنے آپ سے مایوس
یہ کس بدن میں اتارا گیا مجھے لا کے
یہ کون مجھ میں چھپا تھا حریفِ نامحسوس

نومبر ۱۹۵۹ء

آشوبِ چشم

بہت دنوں میں پکارا تری مہک نے مجھے
کہ اب تو چھوٹ گیا آئینے سے بھی پارا
گئی تھی چھوڑ کے دن رات راہ تکنے مجھے
بہت دنوں میں پکارا تری مہک نے مجھے
مثالِ طور جلایا تری جھلک نے مجھے
تو میکے آئی، میں آشوبِ چشم کا مارا
بہت دنوں میں پکارا تری مہک نے مجھے
کہ اب تو چھوٹ گیا آئینے سے بھی پارا

=

۱۹۷۳ء

تعارف

میں وہ نہیں ہوں کہ جسکی تلاش میں تم ہو
مگر میں وہ ہوں، تمہاری تلاش تھی جسکو
عجیب فلسفۂ بود و باش میں تم ہو
میں وہ نہیں ہوں کہ جسکی تلاش میں تم ہو
یہ کیسے آئینۂ پاش پاش میں تم ہو
مگر میں وہ ہوں کہ دنیا بھی تاش تھی جسکو
میں وہ نہیں ہوں کہ جسکی تلاش میں تم ہو
مگر میں وہ ہوں تمہاری تلاش تھی جسکو

۱۹۶۷ء

بے پارہ آئینہ

وہ ساتھ ہے کہ جس سے تعارف نہیں کوئی
جانے کہاں ہے وہ جو دعا کا شریک تھا
سچ ہے کہ اب محلِ تأسف نہیں کوئی
وہ ساتھ ہے کہ جس سے تعارف نہیں کوئی
یہ بھی درست ہے کہ میں یوسف نہیں کوئی
وہ خوش ادا تو بن کے زلیخا شریک تھا
وہ ساتھ ہے کہ جس سے تعارف نہیں کوئی
جانے کہاں ہے وہ جو دعا کا شریک تھا

پس و پیش

مجھے گھر لوٹ جانا چاہئے تھا
(مگر اب لوٹ کر بھی کیا کروں گا؟)
یہی نا آب و دانہ چاہئے تھا
مجھے گھر لوٹ جانا چاہئے تھا
تھکن میں کچھ ٹھکانا چاہئے تھا
کہیں سائے میں رک جایا کروں گا
مجھے گھر لوٹ جانا چاہئے تھا
(مگر اب لوٹ کر بھی کیا کروں گا؟)

۲۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء

امانت

اپنا کردار ترے قرب کے لمحوں کیلئے
اک امانت کی طرح میں نے اٹھا رکھا ہے
پیاس اک عمر کی ترسے تری آنکھوں کیلئے
اپنا کردار ترے قرب کے لمحوں کیلئے
تیرے ہونٹوں ترے رخسار کے صفحوں کیلئے
ایک ایک قطرہ جاں میں نے بچا رکھا ہے
اپنا کردار ترے قرب کے لمحوں کیلئے
اک امانت کی طرح میں نے اٹھا رکھا ہے

حالات

حالات خود بھی میرے موافق نہ تھے ابھی
تم سے بھی انتظار کی زحمت نہ ہو سکی
دل اتنی آرزوؤں کے خالق نہ تھے ابھی
حالات خود بھی میرے موافق نہ تھے ابھی
لمحے تمھارے قرب کے لائق نہ تھے ابھی
اظہارِ آرزو کی جو جرأت نہ ہو سکی
حالات خود بھی میرے موافق نہ تھے ابھی
تم سے بھی انتظار کی زحمت نہ ہو سکی

انجامِ کار

سوچا ہے تیری مانگ میں سیندور دیکھ کر
اپنی ہتھیلیوں کی لکیروں کو میٹ لوں
غارِ حرائے زیست کو بے نور دیکھ کر
سوچا ہے تیری مانگ میں سیندور دیکھ کر
کربِ وفا کو ضبط پہ مجبور دیکھ کر
تسکین مانگتی ہوئی نظریں سمیٹ لوں
سوچا ہے تیری مانگ میں سیندور دیکھ کر
اپنی ہتھیلیوں کی لکیروں کو میٹ لوں

محمد علی تاج بھوپالی

۱۳ اپریل ۱۹۷۸ء

۱

کاش پیتے ذرا سلیقے سے
کون کمبخت روکتا تھا تمہیں

اے چہیتے ذرا سلیقے سے
کاش پیتے ذرا سلیقے سے

ہائے جیتے ذرا سلیقے سے
میں برا تھا جو ٹوکتا تھا تمہیں
کاش پیتے ذرا سلیقے سے
کون کمبخت روکتا تھا تمہیں

۲

وادیٔ خار سے گزرتے ہوئے
[1] خیمۂ گل میں کاش رک جاتے
رات بھر لمحہ لمحہ مرتے ہوئے
وادیٔ خار سے گزرتے ہوئے
کاش تھکتے ذرا سفر کرتے ہوئے
کیوں صبا کی طرح سبک جاتے
وادیٔ خار سے گزرتے ہوئے
خیمۂ گل میں کاش رک جاتے

---

[1] "خیمۂ گل" تاج صاحب کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ جو ۱۹۶۷ء میں بھوپال سے شائع ہوا۔

۳

لہ "موت کتنی ہی شاندار سہی
زندگی کا مگر جواب نہیں"
دھیان رکھ اے زوال خوش نگہی
موت کتنی ہی شاندار سہی
یاد اس کی رہی رہی نہ رہی
آدمی گر خود احتساب نہیں
موت کتنی ہی شاندار سہی
زندگی کا مگر جواب نہیں

لہ وجد

25th hour

۱۰ رمئی ۱۹۸۰ء

کس ساعتِ شدید کے نرغے میں آ گئے
ہر چیز دائرے سے نکلتی ہوئی سی ہے
جنگل کے جتنے شیر تھے پنجرے میں آ گئے
کس ساعتِ شدید کے نرغے میں آ گئے
یہ کس ڈگر پہ جاگتے سوتے میں آ گئے
جو شکل حرزِ جاں تھی وہی اجنبی سی ہے
کس ساعتِ شدید کے نرغے میں آ گئے
ہر چیز دائرے سے نکلتی ہوئی سی ہے

بے مکانی

۲۵ مئی ۱۹۸۰ء

اس خاک سے ہزار یونہی جی لگائیے
بے آسمان کر کے رہے گی زمین تو
ہر چند سو طرح کا تعلق نبھائیے
اس خاک سے ہزار یونہی جی لگائیے
مٹی سے ہاتھ، ہاتھ سے مٹی چھڑائیے
ہے بے مکانیوں سے ہی شانِ مکین تو
اس خاک سے ہزار یونہی جی لگائیے
بے آسمان کر کے رہے گی زمین تو

سفید ہاتھی

۱۶ر جون ۱۹۸۰ء

میں کس غلامی میں پھنس گیا ہوں
چھچھوندر سانپ کے دہن میں
نہ چھوٹتی ہے نہ چھوڑتا ہوں
میں کس غلامی میں پھنس گیا ہوں
ضمیر پر کب سے ہنس رہا ہوں
سفید ہاتھی کے پیرہن میں
میں کس غلامی میں پھنس گیا ہوں
چھچھوندر سانپ کے دہن میں

Wrong Court

جون ۱۹۸۱ء

یہ کس کا در کھٹکھٹا رہا ہوں
سڑے ہوئے گوشت کی طلب میں
یہ کس کی دہلیز پہ کھڑا ہوں
یہ کس کا در کھٹکھٹا رہا ہوں
عجب ہوس رنگ ذائقہ ہوں
الجھ گیا ہوں جو روز و شب میں
یہ کس کا در کھٹکھٹا رہا ہوں
سڑے ہوئے گوشت کی طلب میں

نغمہ نوا

کبھی کبھی تو یہی سوچ کر ہوئے خاموش
زمینِ شور میں کیا تخمِ بے نوا بوئیں ـــ
نمو کے خواب سے بوجھل ہے چشم خوش آغوش
کبھی کبھی تو یہی سوچ کر ہوئے خاموش
زمین خود کو سمجھتی رہے ذرا نردوش
ہم اپنا نقش بھی ریگِ آب میں کہاں کھوئیں
کبھی کبھی تو یہی سوچ کر ہوئے خاموش
زمینِ شور میں کیا تخمِ بے نوا بوئیں ـــ

حرفِ ناگفتہ

۸ ستمبر ۱۹۷۸ء

ادب کے نام پہ کیا رہ گیا ہے کہنے کو
مگر وہ بات جو میں چپ رہوں تو رہ جائے

یہ حرف و صوت کا دھارا بہت ہے بہنے کو
ادب کے نام پہ کیا رہ گیا ہے کہنے کو

یہ گھاس پھوس کا چھپر بہت ہے رہنے کو
مگر وہ آگ جو مجھ میں ہے کس جگہ جائے

ادب کے نام پہ کیا رہ گیا ہے کہنے کو
مگر وہ بات جو میں چپ رہوں تو رہ جائے

قطع کلام معاف ...

عرض کرنا صرف اس قدر ہے کہ اول ارادہ تھا صرف ترائیلوں پر مشتمل مجموعہ پیش کرنے کا۔ اسی خیال سے میرے دوست جمیل شیدائی کا مضمون صرف ترائیلوں ہی کی حد تک، اس میں شامل بھی کیا گیا تھا ـــــ لیکن بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے یہ مجموعہ وقت پر شائع نہ ہو سکا اس لیے اس مرحلے پر اس میں نظمیں اور غزلیں بھی شامل کر لی گئیں۔

"اقرا" کے بعد یہ دوسرا مجموعہ "ایلاف" پیش خدمت ہے ـــــ انور نظامی نے اس کی کتابت ابوظبی سے کر کے بھیجی اور محمود سلیم صاحب نے تصحیح، ٹائٹل، سب ٹائٹل اور جزوی کتابت سے نوازا ـــــ میں ان سب کا ممنون ہوں۔

امید کہ اربابِ نظر کو یہ دوسرا مجموعہ بھی پسند آئے گا۔ فقط

۸۔ جنوری ۱۹۸۲ء

(رؤف خیر)

نظمیں

نمو کا جوش سلامت، میں بے نشان نہیں
کمال یہ ہے کہ ہر خاک نم ہے میرے لیے

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

۶ر نومبر ۱۹۷۸ء

مرے جوتے میں پانی بھر گیا ہے
اور اک لمبا سفر درپیش ہے
ابرِ رحمت پہ مجھے رہ رہ کے غصہ آ رہا ہے

اور ادھر میدانِ طائف
خاک آلودہ تھے اندھے ہاتھ
بہہ رہا تھا جب کسی فرقِ مبارک سے لہو
نعلین میں پائے مبارک جم گئے تھے
رحمتِ عالم کے ہونٹوں پہ
مگر پھر بھی دعا تھی

ریگاب

۶؍ جنوری ۱۹۷۹ء

سمندر کے اس پار ریگاب تو ہے
مگر یہ بھی سچ ہے
تمو ہی تمو ہے
میں بنجر زمینوں میں کیا بو رہا ہوں
یہاں واقعی رائگاں ہو رہا ہوں

مردِ ناداں

۱۱ر دسمبر ۱۹۷۸ء

مجھے تسلیم ۔ ہیرے کے جگر سے نابلد ہوں
مگر یہ بھی تو دیکھو
تمہارے ہاتھ میں بھی پھول کی پتّی نہیں ہے

نئے سال کیلئے بھی

۳۱ر دسمبر ۱۹۷۸ء

کوئی آئے
کسی صورت
کسی ساعت بھی آئے
دستکیں لوٹا نہ دونگا
جواباً میں بہر صورت ملونگا

فریبِ تماشہ

۱۰ر جولائی ۱۹۷۹ء

دے کے اخبار میں
اپنے مرنے کی جھوٹی خبر
جی میں آتا ہے دیکھوں کبھی
دوستوں، دشمنوں، رشتہ داروں کا ردِ عمل

اور پھر جی اٹھوں

خود غرض

۱۹ر جون ۷۶ء۱۹

حادثے کی موت مر سکتا نہیں میں
ایک چھوٹی سی دعا پڑھ کر نکلتا ہوں جو گھر سے
سونپ دیتا ہوں میں اپنے آپ کو دستِ خدا میں
گھر سلامت جب پہنچ جاتا ہوں میں
صبح تک پھر یاد آتا ہی نہیں
شام تک جس نے حفاظت کی مری
شام تک پھر یاد آتا ہی نہیں
صبح جس کے نام پر نکلا تھا میں

نا آشنا

۲۴ نومبر ۱۹۷۸ء

سنا ہے میرے ہمسائے کئی ہیں نا آشنا مجھ سے
مگر سچ پوچھیے تو
درحقیقت جاننے والے ہی کتنے ہیں؟

تم کہاں کھو گئے

۲۸ اکتوبر ۱۹۷۸ء

تم کہاں کھو گئے ہو
مجھے لگ رہا ہے
مرے ٹائپ رائٹر کا اک حرف اے (A)
ٹوٹ کر گر گیا ہے
کہیں کھو گیا ہے
تمہیں کچھ خبر ہے کہ اب میری تحریر
بے ربط سی ہو گئی ہے
تم کہاں کھو گئے ہو

شریفانہ معاہدہ

۱۹۷۴ء

چلو صلح کر لیں
یہ جھگڑے انا کے
یہ سب رنجشیں
رنج و رخنہ گر و رائیگاں ہیں

چلو آپ اپنی عدالت کے منصف بنیں
شُبہ کا فائدہ کچھ تمہیں بھی ملے
شُبہ کا فائدہ کچھ مجھے بھی ملے
آدمی کی جبلّت خرابی نہیں
چلو صلح کر لیں

ہم تو مائل بہ کرم ....

۲۷ نومبر ۱۹۷۷ء

تم کوئی بچی نہیں ہو
آج بھی لیکن اداس ہو کہ پونم

چاند کو پانے کی زریں لہر رگ رگ میں سمائے
تمھاری یادِ سجاتے
آسماں کی اور تکتی جا رہی ہو

میں تمھاری گود میں چاند اور سورج ڈال سکتا ہوں
کہو کیا چاہتی ہو

تم کوئی بچی نہیں ہو

خیالِ رزق ہے......

۱۲ر نومبر ۱۹۷۸ء

منہ اندھیرے
ہڑبڑا کر نیند سے جونہی اٹھا ہوں
دودھ کی بوتل کی خاطر
ایک لمبی کیئو میں ٹھیرا ہوا ہوں

تجربہ

۲۰ نومبر ۱۹۷۸ء

مجھے بچوں سے ایسی خاص دلچسپی نہیں تھی
مگر میں باپ جب خود بن چکا ہوں
تو ہر بچے پہ پیار آنے لگا ہے

ٹی وی، کرکٹ اور مکھی

۲۰ نومبر ۱۹۷۸ء

سہانے تھے بہت ٹی وی کے نظارے
حسوں کو مجتمع کر دینے والا ایک ایک لمحہ
وہ ہند و پاک کے مابین کرکٹ میاچ
اور ایسے میں کہیں سے کوئی مکھی آکے ٹی وی سیٹ کے پردے پہ
گناہِ شرک کے دھبّے کی صورت
مستقل بیٹھی ہوئی
منظر منظر آنکھ پہ بارگراں تھی
اُدھر فتح و ظفر میں خاک پر پیشانیاں تھیں
اِدھر مکھی تھی ہر منظر میں شامل
مرے ساتھی نے وہ مکھی نگل لی
اور پھر ٹی وی کا چہرہ صاف تھا

خود بینی

جنوری ۱۹۷۴ء

مِرے کمرے میں آئینہ جڑا تھا
اور اک چڑیا اسیرِ خود نمائی
چلی آتی تھی روزانہ ہی اندر
جو آئینے میں خود کو دیکھتی تھی
تو آئینے پہ چونچیں مارتی تھی
وہ چڑیا مستِ خود بینی بہت تھی
کہیں نزدیک ہی بلّی کھڑی تھی
ذرا جھپکیں جو اس چڑیا کی آنکھیں
چمک بلّی کی آنکھوں میں سوا تھی
کہ اس کے پنجے میں ننھی سی جاں تھی
اِن آنکھوں پہ وہ منظر چھا گیا ہے
مِرے کمرے سے آئینہ گیا ہے

واقعہ سخت ....

۱۰ مئی ۱۹۷۸ء

موٹر سیکل لے کر جب میں گھر سے نکلا
میری ننھی منی بیٹی نے یہ ضد کی
"پپا میں بھی ساتھ چلونگی"

خوفزدہ لہجے میں اس سے۔ میں نے کہا یہ
"میں تو آفس بھاگ رہا ہوں۔ تم مت آنا"

اس نے بھولے پن سے پوچھا
"کیوں پپا۔ کیا آفس میں بڈھا رہتا ہے"
سچ تو یہ ہے میں انکار نہیں کر پایا

نظم

۱۰ مارچ ۱۹۷۷ء

منہ اندھیرے روز چوکھٹ چھوڑتا ہوں
فائلوں میں سر کھپا کر
رات کتنی دیر سے گھر لوٹتا ہوں
ایک عرصے سے یہی معمول ہے

اپنی ننھی منی بیٹی کی مناجاتیں
وہ پیاری پیاری باتیں
کب سنوں سینہ پھلا کر

سوچتا ہوں!

فاعتبرو یا اولی الابصار

۲۴ر نومبر ۱۹۷۸ء

میں ساون کا کوئی اندھا نہیں ہوں
مری چشم تماشہ میں تو ہے ہر رنگ عریاں
سوائے اک ہرے کے

نظم

۲۲ر جون ۱۹۷۶ء

ہائے کیا کیا لوگ تھے ماں باپ کی خاطر
کٹورا دودھ کا لے کر
کھڑے رہتے تھے ساری رات
تاکہ آنکھ کھل جائے تو انکی نذر کر دیں

اور میری ماں
مرے کمرے میں میرا کھانا رکھّے
رات کے پچھلے پہر تک راہ تکتی ہے میری
تاکہ اپنے لاابالی پن کے کارن
رات کو لوٹوں تو بھوکے پیٹ ہی میں سو نہ جاؤں

قابیل

اٹھا کے دیکھئے شاہد ہے آج تک تاریخ
کہ زندگی کا کوئی مرحلہ ہو
بھائی کو شکست بھائی کے ہاتھوں ہوئی ہے
کہ اتنی دیدہ دلیری
پرائے خوں میں کہاں!

غزلیں

شہر میں اتنے پیارے ہم اپنی کس خوبی سے ہوئے
قابلِ رشک و خوش قامت تیری محبوبی سے ہوئے

بہت دنوں سے کچھ اپنا پتہ نہیں ملتا
کبھی تو چہرہ کبھی آئینہ نہیں ملتا

وہ آب جو ہوں کہ جس میں ہزار قطرے ہیں
تو تشنہ لب ہے کیوں مجھ سے آ نہیں ملتا

۲۹ر جون ۱۹۷۷ء

میرے شریکِ جرم مرے یار تم بھی تھے
میں پارسا نہ تھا تو گنہگار تم بھی تھے

کیا کیا ملال ہے کہ بکاؤ نہیں ہیں ہم
اتنی خبر نہ تھی کہ خریدار تم بھی تھے

سچ ہے کہ سود مند نہ تھی کچھ انا مری
لیکن یہ واقعہ ہے زیاں کار تم بھی تھے

اک نفسِ ناشناس تھا میں سر سے پاؤں تک
اچھا ہوا کہ آئینہ بردار تم بھی تھے

اتری نہ بام سے کبھی آوارگی مری
میرے گواہ اے در و دیوار تم بھی تھے

تم سے تو خیر کوئی شکایت نہیں مگر
میں خوش گماں تھا اور ملنسار تم بھی تھے

ہم تو صدا بصحرا ہوئے خیر سارشتاً
تم کو ہوا تھا کیا لبِ اظہار تم بھی تھے

جولائی ۱۹۷۷ء

جس روپ میں بھی چاہے تماشہ گرد رہو
اتنا ہو اپنے ہونے کی پہچان تو رہو

بے خواب آسماں کا سفر بھی سرشت ہے
دم بھر خمارِ خواب غنیمت ہے سو رہو ــــ!

قاتل ہوں یا خضر ہوں کھلے گا یہ کس طرح
اے بدگمان لوگو مرے ساتھ تو رہو

ہر کشتِ جاں تو دانۂ گندم پسند ہے
کاٹو گے رات گر کوئی سورج بھی بو رہو

مجھ سے گزر کے جاؤ اگر اختیار ہے
یا میرے ساتھ ساتھ مرے ہمسفر رہو

تعمیرِ آسماں کے لئے اس زمین پہ
یوں جی ابھی بُرا نہ کرو بے گھر ــــ رہو

دھندلا نہیں ہے کوئی بھی منظر رُوت خیر
بس اتنی شرط ہے کہ نہ آنکھیں بھگو رہو

ایلاف

۱۳؍اکتوبر ۱۹۷۷ء

ہزار تہنیتیں بھی ملیں، گلے بھی ہوئے
مری کتاب پہ دیمک کے تبصرے بھی ہوئے

خمارِ خواب کے بے خواب تجربے بھی ہوئے
وہ دن بھی کیا تھے ترے نام رتجگے بھی ہوئے

تمام جھوٹی انا تھی یہی تو اک سچ ہے
ہمیں تو ہونا تھا رسوا ترے لیے بھی ہوئے

زمیں سے ربط مگر ٹوٹ ہی نہیں پاتا
دراز اپنی اڑانوں کے سلسلے بھی ہوئے

ہزار قرب کے پہلو تھے درمیان مگر
پہاڑ جیسی روایت کے فاصلے بھی ہوئے

رکے تو بادِ صبا سے بھی خوف آتا تھا
چلے تو خیر ہواؤں کے سامنے بھی ہوئے

مارچ ۱۹۷۸ء

کیا کیا نہ اس نواح میں ہم سے گلے ہوئے
تیرے لئے بنائے گئے تھے ترے ہوئے
میدانِ جسم و جاں میں بڑے معرکے ہوئے
ہم سے کبھی وہ صلح کے قائل نہ تھے، ہوئے
ان بے مکانیوں نے مجھے لامکاں کیا
پاؤں کہیں زمیں میں نہیں ہیں دھنسے ہوئے
اُس پیرِ تسمہ پا کا ہمیں نے کیا لحاظ
ہم اور ورنہ رہنے لگیں یوں پھنسے ہوئے
سجدہ گزار ہے تری چوکھٹ پہ چاندنی
مٹی کے اپنے پاؤں ہیں پتھر بنے ہوئے

۲۰ر جولائی ۱۹۷۸ء

تماشہ ہے رسوائی جاں سے ڈر کر کہاں جاؤ گے
ہیں شیشے کے سب لے کے ہاتھوں میں پتھر کہاں جاؤ گے
سجے بے چہرگی بے لباسی مقدر کہاں جاؤ گے
تعاقب میں ہے آنکھ منظر بمنظر کہاں جاؤ گے
انھیں کیا خبر آب و گل سے گزرنے میں کیا لطف ہے
تیر مدوں نے یوں تو کہا تھا کہ بے سر کہاں جاؤ گے
کئی آئینے راہ روکے کھڑے ہیں ذرا سانس لو
یہی دیکھنا ہے کہ خود سے گزر کر کہاں جاؤ گے
یہی بے زمینی اگر خیر وابستہ جاں رہے
اٹھائے ہوئے آسمان اپنے سر پر کہاں جاؤ گے

۶ راگست ۱۹۷۸ء

مرا ہم نفس جو گنا ہوں میں تھا — وہی تو مخالف گواہوں میں تھا

جو پتھر کا بت شاہراہوں میں تھا — کبھی وقت کے سربراہوں میں تھا

تجھے چھوڑ کر بے پناہوں میں تھا — یہی نامِ گم کردہ راہوں میں تھا

کبوتر کو گھیرے ہوئے تھے عقاب — کوئی خوش نظر بد نگاہوں میں تھا

دعائے فروزاں لہو کو مرے — اندھیرا اتری خوابگاہوں میں تھا

یقیں آ گیا یہ زمیں گول ہے — جدھر دیکھئے تو نگاہوں میں تھا

مرے ہاتھ میں وسعتِ آسماں — مرا پاؤں دلدل کی باہوں میں تھا

وہاں کون تھا خیر اپنے سوا
جو ہمدرد تھا خیر خواہوں میں تھا

۱۶ر اگست ۱۹۷۸ء

دل دکھ نہ جائے بات کوئی بے سبب نہ پوچھ
خانہ بدوش لوگوں سے نام و نسب نہ پوچھ

نانِ جویں کی آس بھی کیا شئے ہے اب نہ پوچھ
پردیسیوں سے مشغلۂ روز و شب نہ پوچھ

بے گھر ہوئے ہیں دیدۂ بے خواب کے قتیل
اب جگنوؤں سے لذتِ رودادِ شب نہ پوچھ

میرے لہو ترنگ سے ٹھیرا ہے سرخ رو
کیا کیا نہ رنگ ہیں تری آنکھوں کے اب نہ پوچھ

اک شعلۂ شراب بھی ہیں آفتاب بھی
اِس زمہریر میں ترے شاداب لب نہ پوچھ

تیرے لیئے میں آئینہ پاش پاش ہوں
کیا کیا ہے میرے واسطے اک تیری چھب نہ پوچھ

ہم خود شناس بھی ہیں زمانہ شناس بھی
اس مرحلے میں جان سے گزرے ہیں کب نہ پوچھ
کیسی عجیب صورتِ حالات ہو گئی
پتھرا گیا ہے خیر جو شہرِ طلب نہ پوچھ

☆

تعارف ہی تو نا ممکن ہے میرا
بدن کافر ہے دل مومن ہے میرا

یہ کیسے کوچۂ سر بستہ میں ہوں
پلٹ آنا بھی نا ممکن ہے میرا

۳۰ اکتوبر ۱۹۷۸ء

زہر لگتا ہوں تو اوتاروں کے بیچ
بوند بھر امرت ہوں بیماروں کے بیچ

میں کسے ناراض کس کو خوش کروں
موم کا پتلا ہوں انگاروں کے بیچ

راہ سازی تو مری فطرت میں ہے
قید کیا رہتا میں دیواروں کے بیچ

میں اسی سکے میں لوٹا تا بھی ہوں
آئینہ ہوں آئینہ داروں کے بیچ

ہم پریشاں، بے زمینی کے شکار
لوگ خوش اپنی ہی دیواروں کے بیچ

خیر مانا میں کوئی سورج نہیں
اک کرن ہوں اور اندھیاروں کے بیچ

۱۰ر جنوری ۱۹۷۹ء

رہے خیال کہ چھاؤں بہت گھنی نہ رہوں
بچوں ہوا سے تو محروم روشنی نہ رہوں

میں اس نواح میں کب تک شنیدنی نہ رہوں
یہ کس عذاب میں ہوں حرفِ گفتنی نہ رہوں

میں خاکسار یقیناً ہوں اتنی آگ کے ساتھ
کہ سرکشوں میں سراسر فروتنی نہ رہوں

اگر یہی ہے ہنر تو مجھے نہیں آتا
کہ اپنی ذات میں باہر کی سنسنی نہ رہوں

ہزار خواہشیں ایسی کہاں کہ دم نکلے!
یہ کیا مذاق ہے اتنا بھی کیا غنی نہ رہوں

یہ واقعہ ہے کہ منظر بدل ہی جاتا ہے
تو کیا عجب ہے کسی دن میں دیدنی نہ رہوں

ردیف بخیر یہ لیے جا رہے مستقیم خطوط
مزہ نہ آئے اگر خطِ منحنی نہ رہوں

یکم مئی ۱۹۷۹ء

تشنہ رہیں گے اپنے بگڑنے کے مرحلے
آئے جو ہیں نگاہ میں پڑنے کے مرحلے

میرے لئے زمان و مکاں پھیلنے لگے
طے ہو رہے ہیں تجھ سے بچھڑنے کے مرحلے

یہ چھالا چھالا پاؤں یہ ہاتھوں کی سختیاں
یاد آگئے تتلیوں کے پکڑنے کے مرحلے

آنکھوں میں ریت بھر گئی، ہمدرد تھی ہوا
تا دیدنی تھے خیمے اکھڑنے کے مرحلے

پھر جیسے پتھروں کے حوالے ہوئے ہیں ہم
نازک تھے آئینے سے بچھڑنے کے مرحلے

خود کو سنبھالنا بھی قیامت ہے ان دنوں
اب ہم ہیں اور آگ پکڑنے کے مرحلے

خوش تھے رؤف خیر جو دنیا سے لڑ چکے
باقی ہیں اپنے آپ سے لڑنے کے مرحلے

۲۷ر جون ۱۹۷۹ء

میں اب زمیں گزیدہ، فلک نارسیدہ ہوں
اس پر بھی خشک لب ہوں، نہ ہی آبدیدہ ہوں
بے عیب کس کی ذات ہے، تو بھی ہی یہاں
اے دوست میں فراخ دل و خوش عقیدہ ہوں
آنسو تمام ۔ پیرہن قہقہہ میں ہیں
لیکن کسے بتاؤں کہ دامن دریدہ ہوں
گو میں صدا بصحرا ہوں دنیا کے واسطے
یہ بھی بہت ہے تیرے لئے تو شنیدہ ہوں
کچھ اور بڑھ گیا "مجھے" پڑھنے کا اشتیاق
میں تو وہی عبارت صد خط کشیدہ ہوں
ہنستا تھا دیکھ کر تری بے چہرگی کبھی
دیکھا جو آئینہ تو لگا سر بریدہ ہوں
دنیا سے سر اٹھا کے ملونگا رؤف خیر
ہاں آئینے کے سامنے گردن خمیدہ ہوں

۲۰ر دسمبر ۱۹۷۸ء

عقل سے آنکھ تو ملاتا ہوں
دل کے ہاتھوں فریب کھاتا ہوں

ساری دنیا سراب لگتی ہے
تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہوں

تو جو بت ہے تو ٹوٹتا ہے تجھے
میں کہاں ایسے سر جھکاتا ہوں

ہائے سب کچھ تمھیں تھے میرے لئے
یاد کرتا ہوں مسکراتا ہوں

رشتۂ تارِ عنکبوت میں ہوں
توڑتا ہوں تو ٹوٹ جاتا ہوں

خیر پہچان ہی سنبھال اپنی
میں اگر صرف خاک اڑاتا ہوں

۱۰ر فروری ۱۹۷۳ء

طے ہے کہ شہرِ جاں کی فضا سے بھی جاؤنگا
جینا ہی ہے تو راہِ فنا سے بھی جاؤنگا

یہ سوچ کر تباہ رہا ہوں تمھارا ساتھ
تم سے چھٹا تو عہدِ بقا سے بھی جاؤنگا

یہ تو زیادتی ہے کہ میں ہی وفا کروں
اس دن کی سوچ جب میں وفا سے بھی جاؤنگا

پانی پہ اک حباب سہی زندگی مری
لڑتا ہوا غرورِ ہوا سے بھی جاؤنگا

چہرہ تو آئینہ ہے چھپاتا کہاں پھروں
تیرے لیے جو راہِ ریا سے بھی جاؤنگا

آنکھوں پہ بڑھ گیا ہے بہت منظروں کا بوجھ
اب چپ رہا تو زورِ نوا سے بھی جاؤنگا

سمٹا ہوا ہوں میں کہ اسی میں بھرم بھی ہے
بکھرا تو حدِّ دستِ صبا سے بھی جاؤنگا

۲۲ر فروری ۱۹۷۴ء

اس کا شمار آنکھوں کی ٹھنڈک میں رکھیے
وہ پھول ہے تو کیا اسے پستک میں رکھیے

یہ میں نہیں ہوں کوئی پیاسوں کی بیٹھک
دل کے بجائے مجھ کو [illegible] میں رکھیے

اس لذت ثبات سے اکتا نہ جائے دل
کچھ کچھ شکست و ریخت بھی مسلک میں رکھیے

سب اپنے خوب و زشت کا البم دکھا دیا
وہ سادہ لوح ہے اسے کیا شک میں رکھیے

[illegible] تو نہ [illegible] کبھی لکھیے جو جی کا حال
[illegible] لفظ و معنی گنجلک میں رکھیے

اس سے نفس نفس کا تعلق ہے [illegible]
اس کو سبھی کے درد کی [illegible] میں رکھیے

زاویۂ نگاہ کی بے حرمتی نہ ہو
ہر حاشیہ خلوص کی عینک میں رکھیے
ٹوٹے کبھی تو رشتۂ تیر و سپر بھی خیر
اک دوسرے کو کیا ہدف زک میں رکھیے

کیسے سمجھاؤں کہ بے سایگی کیا ہوتی ہے
شکر کیجیے کوئی سایہ جو ابھی ہے سر پر
زیرِ سایہ ہمیں دیکھو تو بُرا مت جانو
ہم نے اک عمر کڑی دھوپ سہی ہے سر پر

۲۴ مارچ ۱۹۸۰ء

پل بھر میں بے سر ہوتے ہیں کیا تم ۔ کیا میں
مٹی کے پیکر ہوتے ہیں کیا تم ۔ کیا میں
گندم سے بچئے تو حوا لے اُڑتی ہے
ویسے پیغمبر ہوتے ہیں کیا تم ۔ کیا میں
چہروں پر لکھا ہوتا ہے کچھ دل میں کچھ
دھوکے تو اکثر ہوتے ہیں کیا تم ۔ کیا میں
بے سایہ ہو کر کب کوئی خوش ہوتا ہے
مجبوراً بے گھر ہوتے ہیں کیا تم ۔ کیا میں
پاپانی تو اک دھوکا ہے سچ پوچھو تو
دلدل یا ساگر ہوتے ہیں کیا تم ۔ کیا میں
خیر بھلے ہی کہلاؤ تم کیا ہوتا ہے
اندر سے تو شر ہوتے ہیں کیا تم ۔ کیا میں

نومبر ۸۰ ۱۹ء

دنیا نہیں بدلی ہے زمانے ہی تو بدلے
ہم خانہ خرابوں کے ٹھکانے ہی تو بدلے

ہم جیسے جیالے ہیں تو بے آس نہ ہونا
اے یارِ صداقت ترے تانے ہی تو بدلے

اک خطِ شکستہ ہیں ہمیں دستِ ہنر میں
اس حال میں الفاظ کے معنے ہی تو بدلے

پڑتا نہیں موسم کے بدلنے سے کوئی فرق
کچھ بول ترے ملنے کے بہانے ہی تو بدلے

ہر کوہ صفت روئی کی مانند اڑا ہے
یہ رنگ یہ تیور بھی ہوا نے ہی تو بدلے

ہم وحشت فزدوں کو نہیں خیر زمیں تنگ
یہ چال چلی شہرِ وفا نے ہی تو بدلے

۱۶ جون ۱۹۸۰ء

اہلِ ہوس میں خیر بظاہر بھی ہم ہوئے

جی کو ملال یوں ہے کہ شاعر بھی ہم ہوئے

اے دل نہ ہونا چاہیئے تھا پھر بھی ہم ہوئے

رسوا کبھی کبھی تری خاطر بھی ہم ہوئے

ٹھوکر نہیں لگی ابھی پائے ثبات کو

کس منزلِ نفی کے مسافر بھی ہم ہوئے

یہ حیلئے یہی سہی کہ سبھی خیر خواہ تھے

اپنے حریف اول و آخر بھی ہم ہوئے

ہم ہی تو چشم خاک میں بکھرے تو خراب

اور آسمان نژاد بالآخر بھی ہم ہوئے

سب جھوٹ تھا بچاؤ کے رستے ہزار تھے

سچ ہے شکار تو متواتر بھی ہم ہوئے

۲۰۔ جنوری ۱۹۸۱ء

کچھ دوستوں سے نیک گمانی میں کٹ گئی
باقی خلوصِ دشمنِ جانی میں کٹ گئی

اب رتجگے ہیں جیسے لہو میں رچے ہوئے
کیا رات تھی کہ ایک کہانی میں کٹ گئی

چھُٹتے جو خاک سے تو بہت آسمان تھے
اک عمر یونہی قیدِ مکانی میں کٹ گئی

تم سے چھٹے تو راہ کے سب پیچ و خم کھلے
زنجیر ربطِ خاص روانی میں کٹ گئی

خود کو ہمیں سنبھال نہ پائے رؤف خیر
دیوارِ ضبط ایک ہی پانی میں کٹ گئی

گماں گزرتا ہے گم کردہ راہ بھی میں ہوں
کہ اس نواح میں اک بے پناہ بھی میں ہوں

یہ لوگ کس لئے شاکی ہیں منصفی سے تری
خلاف اپنے حقیقی گواہ بھی میں ہوں

یہ اور بات کہ آنکھیں ہیں آسماں کی طرف
ہلاکِ حرفِ سفید و سیاہ بھی میں ہوں

ملال یہ ہے کہ تو، سوجھتا نہیں مجھ کو
کمال یہ ہے کہ تیری نگاہ بھی میں ہوں

وہی ہوں میں نہ چلا سحر سامری جس پہ
عصائے معرکۂ لاالٰہ بھی میں ہوں

تمہیں خبر نہیں شب خون مارنے والو
جو ابرِ مہ سے لڑی وہ سپاہ بھی میں ہوں

تمہیں بھی خیر سے دعویٰ ہے بادشاہی کا
تمہیں خبر ہو کہ اک کج کلاہ بھی میں ہوں

ستمبر ۱۹۸۱ء

نہ میں عرب ہوں نہ دنیا عجم ہے میرے لئے
مری خموشی ہی گویا بھرم ہے میرے لئے
نمو کا جوش سلامت، میں بے نشاں نہیں
کمال یہ ہے کہ ہر خاک نم ہے میرے لئے
کوئی خمار ہو یا بُت ہو ٹوٹ جاتا ہے
عجیب مرحلۂ کیف و کم ہے میرے لئے
یہی نظر تو کہیں ٹھیرنے نہیں دیتی
ترے لیے جو خدا ہے، صنم ہے میرے لئے
نہ اپنی فکر ہی مجھ کو رہی نہ دنیا کی
ترا خیال بڑا خوش قدم ہے میرے لئے
اسے قریب سے دیکھوں تو جانے کیا نکلے
وہ شخص خیر ابھی محترم ہے میرے لئے

املاف

تابکے منزل بمنزل ہم مسافر بھاگتے ۱۸ستمبر ۱۹۷۸ء

آنکھ اب ٹھہری ہوئی ہے اور مناظر بھاگتے

اے حریفِ ہر قدم شہ مات سے بچنے کی سوچ

اِس بساطِ خاک سے کیا ہم سے شاطر بھاگتے

ہم تو آئے ہیں یہاں مٹنے مٹانے کے لئے

اس زمینِ کربلا سے کس کی خاطر بھاگتے

بس میں آجانے کا جذبہ بس میں کرنے کی ہوس

خاک و باد و آب و آتش بھی ہیں قاصر بھاگتے

سر کہیں پاؤں کہیں آنکھیں کہیں چہرہ کہیں

اس ہوس میں کھو گئی پہچان آخر بھاگتے

خیر شب خوں مار کر چھپ جانے والے ہم نہیں

معرکہ سر کرنے نکلے ہیں تو کیا پھر بھاگتے

کھود لیتے ہیں کنواں شہداب پالیتے ہیں خیر

اِس زمینِ سخت سے کیا ہم سے شاعر بھاگتے

۲۲ ستمبر ۱۹۷۸ء

اے ہوئے شہر لہجے تھے ترے اکھڑے ہوئے
پھول زخمی ہو گئے گلدان کے ٹکڑے ہوئے

ایک بے تسکین بے خوابی سی ہے جزو بدن
سو گئے تھے جیسے ہم سمٹے ہوئے سکڑے ہوئے

بے دھواں بے گرد، بے آواز تھے سب راستے
ہم جہاں پہنچے وہاں خیمے ملے اکھڑے ہوئے

تھا فقیہہ شہر تو ثقلِ سماعت کا شکار
سن رہا تھا کون آخر کیوں بیاں دکھڑے ہوئے

کیا بتائیں کس تکلف میں کٹا عہدِ بہار
کب گریباں چاک تھا دامن کے کب ٹکڑے ہوئے

خیر ہم تو دھوپ کے بن باس پر بھیجے گئے
کس سفر میں ساتھ اپنے پھول سے مکھڑے ہوئے

۱۵ راکتوبر ۱۹۷۸ء

لٹنے کا شوق کب تھا جو سج دھج کے شہر میں
لوگ آ گئے تھے گاؤں سے سب تج کے شہر میں

کیچڑ گلی گلی ہے تو موسم خراب ہے
نکلا کرو نہ اس طرح سج دھج کے شہر میں

انہونی تھی جو ہو کے رہی دکھ یہی تو ہے
کیا سائرن تھے رہ گئے بج بج کے شہر میں

بونے خود اپنے سایوں سے خوش ہم سے ہیں خفا
اندھیر کس قدر ہے یہ سورج کے شہر میں

اس جنگ میں تو دستِ اماں بھی شریک ہے
اک بے کلی کا راج ہے دھیرج کے شہر میں

مہنگا پڑے گا میرا لہو سوچ لیجئے
میں سخت جاں ہوں قتلِ مروّج کے شہر میں

پائے ثبات ہوں میں ہر اک پل صراط پر
دستِ دراز ہوں کلہ رنج کے شہر میں

انصاف کی جو پوچھو تو کہہ دوں خطا معاف
احساسِ مجرمانہ ہے ہر رنج کے شہر میں

ہمراہ جبرئیل و ابابیل بھی نہیں
بھیجا گیا ہوں اوس کے خزرج کے شہر میں

میں خطِ خیر اسود و ابیض کے درمیان
حرفِ صحیح — لہجۂ کج مج کے شہر میں

○

جب سے دیواروں کے بھی کان ہوا کرتے ہیں
بات کیا کرتے فقط ہونٹ ہلا کرتے ہیں

ریڈیو

۲ر جون ۱۹۷۹ء

تم بھرے وقتوں میں کیسے جاں کی بازی کھیلتے
جاؤ گھر بیٹھو کسی کونے میں رمّی کھیلتے

کیا بھرے اشجار آخر ہاتھ خالی ہو گئے
بس ہوا گزری تھی یونہی ڈالی ڈالی کھیلتے

کیسے کیسے ذہن ہیں اس کھیل کے پیچھے یہاں
تم اکیلے جیتے ہم سے تو ہم بھی کھیلتے

اے بساطِ شہر تیرے کتنے مہرے پٹ گئے
اب تو اندازہ ہوا ہو گا [illegible] ہمیں ہم بھی کھیلتے

۱۹ر اگست ۱۹۸۰ء

رستے میں تو خطرات کی سن گن بھی بہت ہے
منزل پہ پہنچنے کی ہمیں دھن بھی بہت ہے

ہر شہر میں تازہ ہے تو بس زخم تعصب
کچھ لذتِ ناخن کا تعاون بھی بہت ہے

کچھ ہاتھوں سے کچھ ہاتھوں سے کالک نہیں جاتی
ہر چند کہ بازار میں صابن بھی بہت ہے

وہ ہاتھ تحفظ کی علامت جسے کہیے
محسوس یہ ہوتا ہے وہی سن بھی بہت ہے

اک جسم کے مانند ہیں ہم لوگ کہیں ہوں
ٹھوکر سے اکھڑتا ہے تو ناخن بھی بہت ہے

ہم شعر کہا کرتے ہیں وجدان کے بل پر
کچھ لوگوں کو زعم فعلاتن بھی بہت ہے